مقامِ صحابہؓ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

منتخب تحریروں کا مجموعہ

مرتبہ
عاصم نعمانی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست

پیش لفظ

جب بھی کوئی تحریک اسلامی نظام کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے گی تو اُسے لازماً چند سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مثلاً:

- اسلام انسان کے اندر کس سیرت اور کردار کی تخلیق کرنا چاہتا ہے
- اسلامی حکومت کے فرائض کیا ہوتے ہیں؟
- اسلام کا نظامِ حکمرانی کن خصوصیات کا حامل ہوتا ہے؟
- اسلام کی رہنمائی میں تشکیل پانے والے معاشرے کے خدوخال کیا ہوتے ہیں؟

اقامتِ دین کی کوئی تحریک ان سوالات کو نظر انداز نہیں کر سکتی کیونکہ اس کی دعوت انسانی زندگی کی ہمہ پہلو تعمیر ہی سے عبارت ہوتی ہے اور اسلام اس تعمیر سے متعلق ہر سوال کا جواب پیش کر چکا ہے۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی تحریریں اسی حقیقت کی شہادت فراہم کرتی ہیں ان کی تحریروں کا یہ مختصر مجموعہ "مقامِ صحابہؓ" اسی شہادت کا ایک عکس ہے ـــــ اس مختصر مجموعے میں جو اقتباسات درج کیے گئے ہیں ان کے مکمل حوالے بھی دیے گئے ہیں تا کہ مفصّل مطالعہ کے خواہشمند حضرات کو اصل مآخذ تک پہنچنے میں زحمت پیش نہ آئے۔

(مرتب)

رسول اللہؐ کے ساتھیؓ

اسوۂ صحابہؓ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونے (اسوہ) کی طرف توجہ دلانے کے بعد اللہ تعالیٰ صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل کو نمونے کے طور پر پیش فرماتا ہے تاکہ ایمان کے جھوٹے مدعیوں اور سچے دل سے رسولؐ کی پیروی اختیار کرنے والوں کا کردار ایک دوسرے کے مقابلے میں پوری طرح نمایاں کردیا جائے۔ اگرچہ ظاہری اقرارِ ایمان میں وہ (منافقین) اور یہ یکساں تھے مسلمانوں کے گروہ میں دونوں کا شمار ہوتا تھا اور نمازوں میں دونوں شریک ہوتے تھے، لیکن آزمائش کی گھڑی پیش آنے پر دونوں ایک دوسرے سے چھٹ کر الگ ہوگئے اور صاف معلوم ہوگیا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مخلص و وفادار کون ہیں اور محض نام کے مسلمان کون ؟

(تفہیم القرآن جلد چہارم) سورۂ احزاب حاشیہ ۳۶

صحابۂ کرامؓ — امراءِ قریش — اور رسولِ خدا

ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق قریش کے سردار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے کہ یہ بلالؓ اور صہیبؓ اور عمارؓ اور خبابؓ اور ابن مسعودؓ جیسے غریب لوگ جو تمہاری صحبت میں بیٹھا کرتے ہیں، ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں ہٹاؤ تو ہم

تمہاری مجلس میں آسکتے ہیں اور معلوم کرسکتے ہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر تمہارے گرد جمع ہوئے ہیں اور شب و روز اپنے رب کو یاد کرتے ہیں، ان کی معیّت پر اپنے دل کو مطمئن کرو اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔

(تفہیم القرآن جلد سوم — سورۂ کہف، حاشیہ ۲۸)

صحابہؓ کے حق میں ملائکہ مقربین کی دعائیں

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ج (المؤمن : ۷)

ترجمہ:۔ "عرش الٰہی کے حامل فرشتے، اور وہ جو عرش کے گرد و پیش حاضر رہتے ہیں، سب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہے ہیں وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں۔"

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی تسلّی کے لیے ارشاد ہوئی ہے۔ وہ اس وقت کفارِ مکہ کی زبان درازیاں اور چیرہ دستیاں، اور ان کے مقابلہ میں اپنی بے بسی دیکھ دیکھ کر دل شکستہ ہو رہے تھے، اس پر فرمایا گیا کہ ان گھٹیا اور رذیل لوگوں کی باتوں پر تم رنجیدہ کیوں ہوتے ہو، تمہارا مرتبہ تو وہ ہے کہ عرشِ الٰہی کے حامل فرشتے اور عرش کے گرد و پیش حاضر رہنے والے ملائکہ تک تمہارے حامی ہیں اور تمہارے حق میں اللہ تعالےٰ کے حضور سفارش کر رہے ہیں۔ عام فرشتوں کے بجائے عرشِ الٰہی کے حامل اور اس کے گرد و پیش حاضر رہنے والے فرشتوں کا ذکر یہ تصوّر دلانے کے لیے کیا

گیا ہے کہ سلطنتِ خداوندی کے عام اہلکار تو درکنار، وہ ملائکہ مقربین بھی، جو اس سلطنت کے ستون ہیں اور جنہیں فرمانروائے کائنات کے ہاں قرب کا مقام حاصل ہے تمہارے ساتھ گہری دلچسپی اور ہمدردی رکھتے ہیں۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم ص۳۹۴، سورۂ مومن حاشیہ ۶)

نگاہ رسالتمآب ﷺ کے فیض یافتہ

ہم ان دونوں حضرات (حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ بن ولید) کی بزرگی اور دینی خدمات کو اسی طرح مانتے ہیں جس طرح ایک مسلمان کو ماننا چاہیے۔ ان سے بغض وحسد ہماری نگاہ میں اسلام اور رسالتمآب سے دشمنی کے مترادف ہے۔ حضرت عمرؓ نے جو کچھ اس دنیا میں دین کی سربلندی کے لیے کیا وہ ان کی کسی ذاتی قابلیت یا ذہانت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ اُس فیض کا اثر تھا جو حضور ﷺ کی جوتیوں کے طفیل انہیں حاصل ہوا پھر جس فیض سے انہیں حصہ ملا، اسی فیض سے حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ اور بے شمار دوسرے صحابہ بھی نوازے گئے۔ حضرت فاروق اعظمؓ اس معاملے میں تنہا نہ تھے بلکہ حضور ﷺ نے انسانیت کے جو نہایت ہی اونچے نمونے پیش کیے ان میں ایک وہ بھی تھے۔

(ترجمان القرآن جلد ۵۲۔ عدد ۳ ص۱۸۴ جون ۱۹۵۹ء)

صحابہ کرامؓ خیر الخلائق تھے

اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ساتھی تو ایسے ہیں کہ ان کو دیکھتے ہی ایک آدمی بیک نظر یہ معلوم کر سکتا ہے کہ یہ خیر الخلائق ہیں کیونکہ خدا پرستی کا نور ان کے چہروں پر چمک رہا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے متعلق امام مالکؒ

بیان کرتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کی فوجیں شام کی سرزمین میں داخل ہوئیں تو شام کے عیسائی کہتے تھے کہ مسیحؑ کے حواریوں کی جو شان ہم سنتے تھے یہ تو اسی شان کے لوگ نظر آتے ہیں۔

تفہیم القرآن، سورہ فتح، حاشیہ ۵۴

شائع شدہ ترجمان القرآن مارچ سنہ ۶۶ء

صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ فدا کاری

وہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم و تدبر اور صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ فدا کاری تھا جس نے تھوڑی مدت کے اندر ہی حالات کا رُخ بدل کر رکھ دیا۔ عربوں کے معاشی مقاطعہ نے اہل مدینہ کے لیے جینا دشوار کر رکھا تھا۔ گرد و پیش کے تمام مشرک قبائل چیرہ دست ہو رہے تھے۔ خود مدینے کے اندر یہود اور منافقین مار آستین بنے ہوئے تھے مگر ان مٹھی بھر مومنین صادقین نے رسولِ خداﷺ کی قیادت میں پے در پے ایسے اقدامات کیے جن سے عرب میں اسلام کا رعب صرف بحال ہی نہیں ہو گیا بلکہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔

(تفہیم القرآن جلد چہارم صفحہ ۵۵)

وہ کٹھن سے کٹھن آزمائش سے بھی سرخرو نکلے

اس معرکۂ کارزار (غزوۂ بدر) میں سب سے سخت امتحان مہاجرین مکہ کا تھا جن کے اپنے بھائی بند سامنے صف آرا تھے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا، کسی کا چچا، کسی کا ماموں کسی کا بھائی، اس کی تلوار کی زد میں آ رہا تھا اور اپنے ہاتھوں اپنے جگر کے ٹکڑے کاٹنے پڑ رہے تھے۔ اس کڑی آزمائش سے صرف وہی لوگ گذر سکتے تھے جنہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ حق سے رشتہ جوڑا ہو اور جو باطل کے ساتھ سارے رشتے قطع کر ڈالنے پر تُل گئے ہوں) اور انصار کا امتحان بھی کچھ کم سخت نہ تھا۔ اب تک تو انہوں نے

عرب کے طاقتور ترین قبیلے قریش اور اس کے حلیف قبائل کی دشمنی صرف اسی حد تک مول لی تھی کہ ان کے علی الرغم مسلمانوں کو اپنے ہاں پناہ دیدی تھی لیکن اب تو وہ اسلام کی حمایت میں ان کے خلاف لڑنے بھی جا رہے تھے جس کے معنی یہ تھے کہ ایک چھوٹی سی بستی جس کی آبادی چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں ہے، سارے ملک عرب سے لڑائی مول لے رہی ہے۔ یہ جسارت صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو کسی صداقت پر ایسا ایمان لے آئے ہوں کہ اس کی خاطر اپنے ذاتی مفاد کی انہیں ذرہ برابر پرواہ نہ رہی ہو۔ آخر کار ان کی صداقتِ ایمانی خدا کی طرف سے نصرت کا انعام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی اور قریش اپنے سارے غرورِ طاقت کے باوجود ان بے سروسامان فدائیوں کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔

(تفہیم القرآن جلد دوم ص ۲۷-۲۶)

رسولِ خدا کے ساتھیوں کی شان امتیاز

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝ (الشعراء: ۲۱۷-۲۱۹)

ترجمہ:- اور اس زبردست اور رحیم پر توکل کرو جو تمہیں اس وقت دیکھ رہا ہوتا ہے جب تم اٹھتے ہو اور سجدہ گزار لوگوں میں تمہاری نقل و حرکت پر نگاہ رکھتا ہے"

یہاں نگاہ رکھنے سے کئی معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ جب نماز باجماعت میں اپنے مقتدیوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اور رکوع و سجود کرتے ہیں، اس وقت اللہ تعالےٰ آپ کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسرے جب راتوں کو اٹھ کر آپؐ اپنے ساتھیوں کو (جن کے لیے سجدہ گزار" کا لفظ امتیازی صفت کے طور پر استعمال

ہوا ہے) دیکھتے پھرتے ہیں کہ وہ اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں اس وقت آپ اللہ کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہوتے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اُس تمام دوڑ دھوپ اور تگ و دو سے واقف ہے جو آپ نے سجدہ گزار ساتھیوں کی معیت میں اس کے بندوں کی اصلاح کے لیے کر رہے ہیں۔ چوتھے یہ کہ سجدہ گزار لوگوں کے گروہ میں آپ کے تمام تصرفات اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ آپ کس طرح ان کی تربیت کر رہے ہیں، کیسا کچھ ان کا تزکیہ آپ نے کیا ہے اور کس طرح مس خام کو کندن بنا کر رکھ دیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضؓ کی اُن صفات کا ذکر یہاں جس غرض کے لیے کیا گیا ہے اس کا تعلق اوپر کے مضمون سے بھی ہے اور آگے کے مضمون سے بھی۔ اوپر کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ آپؐ حقیقت میں اللہ کی رحمت اور اس کی زبردست تائید کے مستحق ہیں، اس لیے کہ اللہ کوئی اندھا بہرا معبود نہیں ہے، دیکھنے اور سننے والا فرمانروا ہے، اس کی راہ میں آپ کی دوڑ دھوپ اور اپنے سجدہ گزار ساتھیوں میں آپ کی سرگرمیاں سب کچھ اس کی نگاہ میں ہیں۔ بعد کے مضمون سے اس کا تعلق یہ ہے کہ جس شخص کی زندگی یہ کچھ ہو، جیسی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، اور جس کے ساتھیوں کی صفات وہ کچھ ہیں جیسی کہ اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں، اس کے متعلق کوئی عقل کا اندھا ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس پر شیاطین اترتے ہیں یا وہ شاعر ہے، شیطان جن کاہنوں پر اترتے ہیں اور شعراء اور ان کے ساتھ لگے رہنے والوں کے جیسے کچھ رنگ ڈھنگ ہیں، وہ آخر کس سے پوشیدہ ہیں، تمہارے اپنے معاشرے میں ایسے لوگ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ کیا کوئی آنکھوں والا ایمانداری کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحابؓ کی زندگی میں اور شاعروں اور کاہنوں کی زندگی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟ اب یہ کیسی ڈھٹائی ہے کہ ان

خدا کے بندوں پر کھلم کھلا کہانت اور شاعری کی پھبتی کسی جاتی ہے اور کسی کو اس پر شرم بھی نہیں آتی۔

(تفہیم القرآن جلد سوم، سورہ الشعراء۔ حاشیہ ۱۳۹)

صحابۂ کرامؓ پر زبان طعن دراز کرنا از روئے قرآن غلط ہے

یہاں اس امر پر بھی متنبہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت (سورۂ حج کی آخری آیت) منجملہ ان آیات کے ہے جو صحابہ کرامؓ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں اور ان لوگوں کی غلطی ثابت کرتی ہیں جو صحابہ پر زبان طعن دراز کرتے ہیں ظاہر ہے کہ اس آیت کے براہ راست مخاطب صحابہ ہی ہیں دوسرے لوگوں کو اس کا خطاب بالتبع پہنچتا ہے۔

(تفہیم القرآن جلد سوم، سورہ حج حاشیہ ۱۲۹)

صحابۂ کرامؓ سے بغض فسق ہے

صحابۂ کرامؓ کو برا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے۔

مَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ ۝

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۶۱ء ص ۵۳)

حضرت معاویہؓ کا شرف صحابیت

صحابی کی تعریف میں اگرچہ سلف میں اختلاف ہے مگر حضرت معاویہؓ کو ہر تعریف کے لحاظ سے شرف صحابیت حاصل ہے۔ آپ کے بعض انفرادی افعال محل نظر

ہو سکتے ہیں مگر بحیثیت مجموعی اسلام کے لیے آپ کی خدمات مسلم اور نا قابل انکار ہیں اور آپ کی مغفرت اور اجر یقینی امر ہے۔

(خط بنام محمد سلیمان صاحب صدیقی، کراچی)
مورخہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۰ء

صحابۂ کرامؓ کے لیے مغفرت کی بشارت

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنۡہُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا ۝ (سورہ فتح۔ آخری آیت)

ترجمہ:۔ اس گروہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔"

ایک گروہ نے اس آیت میں "منہم" کی "من" کو تبعیض کے معنی میں لیا ہے اور آیت کا ترجمہ وہ یہ کرتا ہے کہ "ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اللہ نے ان کی مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔" اس طرح یہ لوگ صحابہؓ پر طعن کا راستہ نکالتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اس آیت کی رو سے صحابہؓ میں بہت سے لوگ مومن و صالح نہ تھے لیکن یہ تفسیر اسی سورۃ کی آیت ۴، ۵، ۸ اور ۲۶ کے خلاف پڑتی ہے، اور خود اس آیت کے ابتدائی فقروں سے بھی مطابقت نہیں رکھتی۔ آیات ۴، ۵ میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام صحابہؓ کے دلوں میں سکینت نازل کیے جانے اور ان کے ایمان میں اضافہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے جو حدیبیہ میں حضورؐ کے ساتھ تھے اور بلا استثناء ان سب کو جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے۔

آیت ۱۸ میں اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کے حق میں اپنی خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے جنہوں نے درخت کے نیچے حضورؐ سے بیعت کی تھی، اور اس میں بھی کوئی استثناء

نہیں ہے۔ آیت ۲۶ میں بھی حضورؐ کے تمام ساتھیوں کے لیے مومنین کا لفظ استعمال کیا ہے، ان کے اوپر اپنی سکینت نازل کرنے کی خبر دی ہے، اور فرمایا ہے کہ یہ لوگ کلمۂ تقویٰ کی پابندی کے زیادہ حقدار اور اس کے اہل ہیں یہاں بھی یہ نہیں فرمایا کہ ان میں سے جو مومنین ہیں صرف انہیں کے حق میں یہ خبر دی جا رہی ہے۔ پھر خود اس آیت کے بھی ابتدائی فقروں میں جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ ان سب لوگوں کے لیے ہے جو محمد رسول اللہؐ کے ساتھ تھے۔ الفاظ یہ ہیں کہ جو لوگ بھی آپ کے ساتھ ہیں وہ ایسے اور ایسے ہیں اسکے بعد یکایک آخری فقرے پر پہنچ کر یہ ارشاد فرمانے کا آخر کیا موقع ہو سکتا تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ مومن وصالح تھے اور کچھ نہ تھے۔ اس لیے یہاں "مِنْ" تبعیض کے معنی میں لینا نظمِ کلام کے خلاف ہے۔ درحقیقت یہاں "مِنْ" بیان کے لیے ہے، جس طرح آیت فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (بتوں کی گندگی سے بچو) میں مِنْ تبعیض کے لیے نہیں بلکہ لازماً بیان ہی کے لیے ہے، ورنہ آیت کے معنے یہ ہو جائیں گے کہ بتوں میں سے جو ناپاک ہیں ان سے پرہیز کرو۔"

(تفہیم القرآن سورۂ فتح حاشیہ ۵۷،
شائع شدہ ترجمان القرآن مارچ ۱۹۶۶ء)

راہِ حق میں صحابہ کرامؓ کا

جوشِ ایثار، شوقِ سرفروشی اور جذبۂ جانسپاری

مومنین صادقین کو پورا احساس تھا کہ جس تحریک کے لیے ۲۲ سال سے وہ سربکف رہے ہیں، اس وقت (یعنی غزوہ تبوک کے موقع پر) اس کی قسمت ترازو میں ہے۔ اس موقع پر جرارت دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ اس تحریک کے لیے ساری دنیا پر چھا جانے کا دروازہ کھل جائے اور کمزوری دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ عرب میں

بھی اس کی بساط الٹ جائے۔ چنانچہ اسی احساس کے ساتھ ان فدائیان حق نے انتہائی جوش وخروش سے جنگ کی تیاری کی۔ سروسامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا آدھا حصہ لا کر رکھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری پونجی نذر کردی۔ غریب صحابیوںؓ نے محنت مزدوری کر کر کے جو کچھ کمایا لاکر حاضر کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار اتار کر دے دیئے۔ سرفروش والنیٹروں کے لشکر کے لشکر ہر طرف سے امنڈ امنڈ کر آنے شروع ہوئے اور انہوں نے تقاضا کیا کہ اسلحہ اور سواریوں کا انتظام ہو تو ہماری جانیں قربان ہونے کو حاضر ہیں۔ جن کو سواریاں نہ مل سکیں وہ روتے تھے اور اپنے اخلاص کی بے تابیوں کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا دل بھر آتا تھا۔

(تفہیم القرآن جلد دوم ص۲۱۱ طبع اول ۱۹۵۴ء)

صحابہ کرامؓ کی غیر معمولی صداقتِ ایمانی کا ثبوت

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ۝ (فتح: ۱۸)

ترجمہ:۔ اللہ مومنوں سے خوش ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کا حال اس کو معلوم تھا اس لیے اس نے ان پر سکینت نازل فرمائی اور ان کو انعام میں قریبی فتح بخشی۔"

یہاں بھی اسی بیعت کا ذکر ہے جو حدیبیہ کے مقام پر صحابہ کرامؓ سے لی گئی تھی اس بیعت کو بیعت رضوان کہا جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اس آیت میں یہ خوشخبری سنائی ہے کہ وہ ان لوگوں سے راضی ہوگیا جنہوں نے اس خطرناک موقع پر

جان کی بازی لگا دینے میں ذرہ برابر تامل نہ کیا اور رسولؐ کے ہاتھ پر سرفروشی کی بیعت کر کے اپنے صادق الایمان ہونے کا صریح ثبوت پیش کر دیا۔ وقت وہ تھا کہ مسلمان صرف ایک تلوار لیے ہوئے آئے تھے۔ صرف چودہ سو کی تعداد میں تھے جنگی لباس میں بھی نہ تھے بلکہ احرام کی چادریں باندھے ہوئے تھے۔ اپنے جنگی مستقر (مدینہ) سے ڈھائی سو میل دور تھے، اور دشمن کا گڑھ، جہاں سے وہ ہر قسم کی مدد لا سکتا تھا صرف ۱۳ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اگر اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کے دین کے لیے ان لوگوں کے اندر خلوص کی کچھ بھی کمی ہوتی تو وہ اس انتہائی خطرناک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ جاتے اور اسلام کی بازی ہمیشہ کے لیے ہر جاتی۔ انکے اپنے اخلاص کے سوا کوئی خارجی دباؤ ایسا نہ تھا جس کی بنا پر وہ اس بیعت کے لیے مجبور ہوئے۔ ان کا اس وقت خدا کے دین کے لیے مرنے مارنے پر تل جانا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ وہ اپنے ایمان میں صادق و مخلص اور خدا اور رسولؐ کی وفاداری میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ اسی بنا پر اللہ تعالےٰ نے ان کو یہ سندِ خوشنودی عطا فرمائی اور اللہ کی سندِ خوشنودی عطا ہو جانے کے بعد اگر کوئی شخص ان سے ناراض ہو یا ان پر زبان طعن دراز کرے تو اس کا معارضہ ان سے نہیں اللہ سے ہے۔ اس پر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جس وقت اللہ نے ان حضرات کو یہ خوشنودی کی سند عطا کی تھی۔ اس وقت تک تو یہ مخلص تھے مگر بعد میں یہ خدا اور رسولؐ کے بے وفا ہو گئے وہ شاید اللہ سے یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ اسے یہ آیت نازل کرتے وقت ان کے مستقبل کی خبر نہ تھی، اس لیے محض اس وقت کی حالت دیکھ کر اس نے انہیں یہ پروانہ عطا کر دیا، اور غالباً اسی بے خبری کی بنا پر اسے اپنی کتاب پاک میں بھی درج فرما دیا تاکہ بعد میں بھی جب یہ لوگ بے وفا ہو جائیں، ان کے بارے میں دنیا یہ آیت پڑھتی رہے اور اس خدا کے علمِ غیب کی داد دیتی رہے جس نے معاذ اللہ ان بے وفاؤں کو

یہ پروانہ خوشنودی عطا کیا تھا۔"

(تفہیم القرآن سورۂ فتح حاشیہ ۳۲ شائع شدہ ترجمان القرآن مارچ ۱۹۶۶ء)

اسلامی نظام حکمرانی کے سچے رمز شناس اور مخلص پیرو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی براہ راست تعلیم و تربیت اور عملی رہنمائی سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا اس کا ہر فرد یہ جانتا تھا کہ اسلام کے احکام اور اس کی روح کے مطابق کس قسم کا نظام حکومت بنانا چاہیے۔ اگرچہ آنحضرتؐ نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن مسلم معاشرے کے لوگوں نے خود یہ جان لیا کہ اسلام ایک شوروی خلافت کا تقاضہ کرتا ہے اس لیے وہاں نہ کسی خاندانی بادشاہی کی بنا ڈالی گئی، نہ کوئی شخص طاقت استعمال کر کے برسر اقتدار آیا، نہ کسی نے خلافت حاصل کرنے کے لیے خود کوئی دوڑ دھوپ یا برائے نام بھی اس کے لیے کوئی کوشش کی بلکہ یکے بعد دیگرے چار اصحاب کو لوگ اپنی آزاد مرضی سے خلیفہ بناتے چلے گئے۔ اس خلافت کو امت نے خلافت راشدہ (راست رو خلافت) قرار دیا ہے۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں خلافت کا صحیح طرز یہی ہے۔

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۸۳۔ باب خلافت راشدہ اور اس کی خصوصیات)

خلفائے راشدین رض

ہیں کرنیں ایک ہی مشعل کی

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل الناس ابو بکر رض صدیق ہیں پھر عمر بن خطاب رض، پھر عثمان رض بن عفان، پھر علی بن ابی طالب رض یہ سب حق پر تھے اور حق کے ساتھ رہے۔ عقیدہ طحاویہ میں اس کی مزید تشریح اس طرح بیان کی گئی ہے:

"ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو تمام امت پر افضل قرار دیتے ہوئے سب سے پہلے خلافت ان کے لیے ثابت کرتے ہیں، پھر عمر رض بن خطاّب کے لیے پھر عثمان رض بن عفّان کے لیے پھر علی بن ابی طالب رض کے لیے اور یہ خلفاء راشدین وائمۂ مہدیّین ہیں۔"

(خلافت وملوکیت ص ۲۳۱-۳۲)

حاصلِ انسانیت

حضور ؐ نے جن خوش نصیب انسانوں کی تربیت فرمائی، انسانیت ان کی کوئی نظیر نہیں پیش کر سکتی۔ انہیں پاکباز اور خوش بخت ہستیوں میں ایک ہستی حضرت عمر فاروق رض کی ہے

(ترجمان القرآن جلد ۵۲ عدد ۳ ص ۱۸۲ بابت جون ۵۹ء)

فضیلتِ عثمان رضی اللہ عنہ

مکہ معظمہ میں حضرت عثمان رضؓ کے شہید ہونے کی خبر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضؓ سے حدیبیہ کے مقام پر بیعت لی تھی ۔ صحابہؓ نے رسول پاک کے ہاتھ پر بیعت اس بات کی کی تھی کہ حضرت عثمان رضؓ کی شہادت کا معاملہ اگر صحیح ثابت ہوا تو وہ سب یہیں اور اسی وقت قریش سے نمٹ لیں گے، خواہ نتیجہ میں وہ سب کٹ کیوں نہ مریں۔ اس موقع پر چونکہ یہ امر یقینی نہیں تھا کہ حضرت عثمان رضؓ واقعی شہید ہو چکے ہیں یا زندہ اس لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف سے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بیعت فرمائی اور اس طرح ان کو یہ شرف عظیم حاصل ہوا کہ آپ نے اپنے دستِ مبارک کو ان کے ہاتھ کا قائم مقام بنا کر انہیں اس بیعت میں شریک فرمایا۔ حضورؐ کا ان کی طرف سے خود بیعت کرنا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ حضورؐ کو ان پر پوری طرح یہ اعتماد تھا کہ اگر وہ موجود ہوتے تو یقیناً بیعت کرتے ۔

(تفہیم القرآن سورہ فتح مطبوعہ ترجمان القرآن فروری ۶۶ء حاشیہ ۱۴)

حضرتِ عثمان رضؓ بحیثیت خلیفۂ راشد

حضرت عثمان رضؓ خود اس امر میں مانع تھے کہ ان کے اقتدار کو بچانے کے لیے مدینۃ الرسولؐ میں مسلمان ایک دوسرے سے لڑیں ۔ وہ تمام صوبوں سے فوجیں بلا کر محاصرین کی تکابوٹی کرا سکتے تھے، مگر انہوں نے اس سے پرہیز کیا۔ حضرت زید رضؓ بن ثابت نے ان سے کہا کہ تمام انصار آپ کی حمایت میں لڑنے کو تیار ہیں، مگر انہوں نے فرمایا کہ اما القتال فلا۔ حضرت ابو ہریرہ رضؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضؓ سے بھی انہوں نے کہا کہ میں لڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں ۔ ان کے محل میں سات سو آدمی

لڑنے مرنے کے لیے موجود تھے، مگر انہیں بھی وہ آخر وقت تک روکتے ہی رہے حقیقت یہ ہے کہ اس انتہائی نازک موقع پر بھی حضرت عثمان رضؓ نے وہ طرز عمل اختیار کیا جو ایک خلیفہ اور بادشاہ کے فرق کو صاف صاف نمایاں کر کے رکھ دیتا ہے ان کی جگہ کوئی بادشاہ ہوتا تو اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے کوئی بازی کھیل جانے میں بھی اسے باک نہ ہوتا۔ اس کی طرف سے اگر مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی، انصار و مہاجرین کا قتل عام ہو جاتا، ازواج مطہرات کی توہین ہوتی، اور مسجد نبوی بھی مسمار ہو جاتی تو وہ کوئی پرواہ نہ کرتا۔ مگر وہ خلیفہ راشد تھے۔ انہوں نے سخت سے سخت لمحوں میں بھی اس بات کو ملحوظ رکھا کہ ایک خدا ترس فرمانروا اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے کہاں تک جا سکتا ہے اور کس حد پر پہنچ کر اسے رک جانا چاہیے۔ وہ اپنی جان دے دینے کو اس سے ہلکی چیز سمجھتے تھے کہ ان کی بدولت وہ حرمتیں پامال ہوں جو ایک مسلمان کو ہر چیز سے بڑھ کر عزیز ہونی چاہئیں۔

خلافت وملوکیت۔ صفحہ ۱۲۰

باب "خلافت راشدہ سے ملوکیت تک"

حدود آشنا حکمران

اسلام جس بنیاد پر دنیا میں اپنی ریاست قائم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمران، راعی اور رعیت بڑے اور چھوٹے، عوام اور خواص سب اس کے تابع ہیں کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں دوست ہو یا دشمن، حربی کافر ہو یا معاہد، مسلم رعیت ہو یا غیر مسلم، مسلمان وفادار ہو یا باغی برسر جنگ، غرض جو بھی ہو شریعت میں اس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے جس سے کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

خلافتِ راشدہ اپنے پورے دور میں اس قاعدے کی سختی کے ساتھ پابند رہی حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے انتہائی نازک اور سخت اشتعال انگیز حالات میں بھی حدودِ شرع سے باہر قدم نہ رکھا۔ ان راست رو خلفاءؓ کی حکومت کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ ایک حدود آشنا حکومت تھی نہ کہ مطلق العنان حکومت۔

خلافت و ملوکیت۔ صفحہ ۱۷۲

باب "خلافت اور ملوکیت کا فرق"

اسلامی تصورِ حکومت ۔ خلفائے اربعہؓ کی نظر میں

خلفائے راشدین کا تصورِ حکومت کیا تھا، فرمانروا ہونے کی حیثیت سے یہ اپنے مقام اور فرائض کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے، اور اپنی حکومت میں کس پالیسی پر عامل تھے، ان چیزوں کو انہوں نے خود خلافت کے منبر سے تقریریں کرتے ہوئے برسرِ عام بیان کر دیا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کی پہلی تقریر جو انہوں نے مسجد نبوی میں عام بیعت کے بعد کی اس میں وہ کہتے ہیں:

"میں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں لیا ہے نہ میں چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے کے بجائے یہ مجھے ملے۔ نہ میں نے کبھی خدا سے اس کے لیے دعا کی۔ نہ میرے دل میں کبھی اس کی حرص پیدا ہوئی۔ میں نے تو اسے بادلِ ناخواستہ اس لیے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنۂ اختلاف اور عرب میں فتنۂ ارتداد برپا

ہو جانے کا اندیشہ تھا میرے لیے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بارِ عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے، جس کے اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔ الا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اٹھالے۔ اب بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو اصحابِ رسول اللہ میں سے کسی اور کو اس کام کے لیے چن لیں میری بیعت آپ کے راستہ میں حائل نہ ہوگی۔ آپ لوگ اگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضورؐ سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا، کیونکہ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجیے۔ اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجیے۔ سچائی امانت اور جھوٹ خیانت۔ تمہارے درمیان جو کمزور ہے، وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں اگر خدا چاہے اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جد و جہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کر دے، اور کسی قوم میں فواحش پھیلیں اور اللہ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کر دے۔ میری اطاعت کرو جب تک کہ میں اللہ اور رسولؐ کا مطیع رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔"

حضرت عمرؓ اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

"لوگو! کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبہ پر نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے...... لوگو میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں تم سے بیان کیے دیتا ہوں، ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو۔ میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج یا اللہ تعالےٰ کے عطا کردہ فے میں سے کوئی چیز نہ وصول کروں مگر قانون کے مطابق اور میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ جو کچھ مال اس طرح میرے پاس آئے اس میں سے کچھ نہ نکلے مگر حق کے مطابق۔"

حضرت عثمانؓ نے بیعت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں انہوں نے فرمایا:۔

"سنو، میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ جان لو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہؐ کی پیروی کرنے کے بعد تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا ہوں۔ ایک۔ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کیے تھے ان کی پیروی کروں گا دوسرے یہ کہ جن معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہل خیر کا طریقہ مقرر کروں گا تیسرے یہ کہ تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھونگا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کاروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے۔

حضرت علیؓ نے حضرت قیسؓ بن سعد کو مصر کا گورنر مقرر کر کے جو فرمان اہل مصر کے نام بھیجا اس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"خبردار رہو، تمہارا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور اسکے رسولؐ کی سنت کے مطابق عمل کریں اور تمہارے معاملات کو اللہ کے مقرر کردہ حق کے مطابق چلائیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو نافذ کریں، اور تمہارے در پردہ بھی تمہارے ساتھ خیر خواہی کریں۔ (خلافت و ملوکیت ۹۱ تا ۹۲)

خلافت راشدہ

خلافتِ راشدہ ہی نہیں بلکہ خلافتِ مرشدہ بھی !

خلافت راشدہ محض ایک سیاسی حکومت نہ تھی بلکہ نبوت کی مکمل نیابت تھی یعنی اس کا کام صرف اتنا ہی نہ تھا کہ ملک کا نظم ونسق چلائے امن قائم کرے اور سرحدوں کی حفاظت کرتی رہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں معلّم مربّی اور مرشد کے وہ تمام فرائض انجام دیتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیا کرتے تھے، اور اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ دار السلام میں دینِ حق کے پورے نظام کو اس کی اصلی شکل اور روح کے ساتھ چلائے، اور دنیا میں مسلمانوں کی پوری اجتماعی طاقت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی خدمت پر لگا دے اس بنا پر یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ صرف خلافتِ راشدہ ہی نہ تھی بلکہ خلافتِ مرشدہ[1] بھی تھی خلافت علی منہاج النبوۃ کے الفاظ اس کی انہی دو خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں اور دین کی سمجھ رکھنے والا کوئی شخص بھی اس بات سے ناواقف نہیں ہو سکتا کہ اسلام میں اصل مطلوب اسی نوعیت کی ریاست ہے نہ کہ محض ایک سیاسی حکومت۔

(خلافت وملوکیت ص ۱۰۵)

---

[1] راشدہ: صحیح راستہ پر چلنے والی، اور مرشدہ: صحیح راستہ پر چلانے والی

خلافتِ راشدہ کا تعامل ۔ اسلام کے دستوری قانون کا ایک ماخذ

اسلام کے دستوری قانون کا تیسرا ماخذ خلافت راشدہ کا تعامل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسلامی اسٹیٹ کو خلفائے راشدین نے جس طرح چلایا اس کے نظائر اور اس کی روایات سے حدیث، تاریخ اور سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اور یہ سب چیزیں ہمارے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسلام میں یہ اصول شروع سے آج تک مسلم رہا ہے کہ دینی احکام و ہدایات کی جو تعبیریں صحابۂ کرام نے بالاتفاق کی ہیں (جسے اصطلاح میں اجماع کہا جاتا ہے) اور دستوری و قانونی مسائل کے جو فیصلے خلفائے راشدینؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے طے کر دیے ہیں وہ ہمارے لیے حجت ہیں، یعنی ان کو جوں کا توں تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ صحابہؓ کے کسی معاملہ میں متفق ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک مستند تعبیر قانون اور معتبر طریقِ عمل ہے۔ جہاں ان کے درمیان اختلاف ہوئے ہیں وہاں تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس مسئلہ میں دو یا دو سے زیادہ تعبیروں کی گنجائش ہے اور ایسے معاملات میں دلیل سے ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ مگر جہاں ان کے درمیان کامل اتفاق ہو گیا ہے وہاں ان کا فیصلہ لازماً ایک ہی تعبیر اور ایک ہی طرزِ عمل کو صحیح اور مستند ثابت کر دیتا ہے، کیونکہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے براہِ راست شاگرد اور تربیت یافتہ تھے اور ان سب کا متفق ہو کر دین کے معاملہ میں غلطی کر جانا دین کے سمجھنے میں راہ صواب سے ہٹ جانا قابل تسلیم نہیں ہے۔

(اسلامی ریاست، نظر ثانی شدہ ایڈیشن صفحہ ۲۹۰)

خلفائے راشدینؓ فیصلے کس طرح کرتے تھے؟

سنّت خلفائے راشدینؓ سے مراد خلفائے راشدینؓ کے وہ فیصلے ہیں جو انہوں نے صحابہ کرامؓ کے مشورے سے خلیفہؓ وقت کی حیثیت سے کیے ہیں۔ اس طرح کے اجتماعی فیصلے سنت نبویؐ کے خلاف کبھی ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ بالخصوص خلفائے اربعہؓ کا ہمیشہ طریقہ یہ تھا کہ جب کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو سب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی کہ اس معاملہ میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ اگر کتاب و سنّت میں کوئی نص مل جاتی تو اس کے مطابق فیصلہ کیا جاتا، اگر نہ ملتی تب صحابہؓ کے اجماع یا کثرت رائے سے اجتہاد کیا جاتا۔

(خط بنام محمد انور عباسی صاحب کراچی مورخہ ۳۰ اکتوبر ۶۷ء)

ایک آزاد ملّت کی تشکیل میں خلافتِ راشدہ کا کردار

خلافت کے متعلق خلفائے راشدینؓ اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کا متفق علیہ تصوّر یہ تھا کہ یہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے۔

موروثی یا طاقت سے برسرِ اقتدار آنے والی امارت ان کی رائے میں خلافت نہیں بلکہ بادشاہی تھی۔

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۸۶)

خلافت راشدہ کا شورائی مزاج

یہ چاروں خلفاءؓ حکومت کے انتظام اور قانون سازی کے معاملے میں قوم کے اہل الرائے لوگوں سے مشورہ کیے بغیر کام نہیں کرتے تھے۔ سنن الدارمی میں حضرت میمون بن مہران کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کا قاعدہ یہ تھا کہ جب ان کے پاس کوئی معاملہ آتا تو پہلے یہ دیکھتے تھے کہ اس معاملہ میں کتاب اللہ کیا کہتی ہے۔ اگر وہاں کوئی حکم نہ ملتا تو یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے معاملہ میں کیا فیصلہ فرمایا ہے اور اگر سنتِ رسولؐ میں بھی کوئی حکم نہ ملتا تھا تو قوم کے سرکردہ اور نیک لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کرتے تھے، پھر جو رائے بھی سب کے مشورے سے قرار پاتی تھی اس کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔

مشورے کے معاملے میں خلفائے راشدینؓ کا تصور یہ تھا کہ اہلِ شوریٰ کو پوری آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرنے کا حق ہے۔ اس معاملہ میں خلافت کی پالیسی کو حضرت عمرؓ نے ایک مجلس مشاورت کی افتتاحی تقریر میں یوں بیان فرمایا تھا:۔

> میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔"

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۸۷/۸۸)

قانون کی بالادستی کی روایت

یہ خلفاء اپنی ذات کو بھی قانون سے بالاتر نہیں رکھتے تھے بلکہ قانون کی نگاہ میں اپنے آپ کو اور مملکت کے ایک عام شہری (مسلمان یا ذمی) کو مساوی قرار دیتے تھے۔ قاضیوں کو اگرچہ رئیس مملکت ہونے کی حیثیت سے وہی مقرر کرتے تھے مگر ایک شخص قاضی ہوجانے کے بعد خود ان کے خلاف فیصلہ دینے میں بھی اسی طرح آزاد تھا جیسا کہ عام شہری کے معاملہ میں۔

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۹۶)

خدا اور خلقِ خدا دونوں کے حق میں امین

بیت المال کو وہ خدا اور خلق کی امانت سمجھتے تھے۔ اس میں قانون کے خلاف کچھ آنے اور اس میں سے قانون کے خلاف کچھ خرچ ہونے کو وہ جائز نہ رکھتے تھے فرمانرواؤں کی ذاتی اغراض کے لیے اس کا استعمال ان کے نزدیک حرام تھا۔ بادشاہی اور خلافت کے درمیان بنیادی فرق ہی ان کے نزدیک یہ تھا کہ بادشاہ قومی خزانے کو اپنی ذاتی ملک بنا کر اس میں اپنی خواہشات کے مطابق آزادانہ تصرف کرتا ہے اور خلیفہ اسے خدا اور خلق کی امانت سمجھ کر ایک ایک پائی حق کے مطابق وصول کرتا اور حق ہی کے مطابق خرچ کرتا ہے

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۸۸)

اسلامی جمہوری قیادت کا مثالی نمونہ

اس خلافت کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں تنقید اور اظہار رائے کی پوری آزادی تھی اور خلفاء ہر وقت اپنی قوم کی دسترس میں تھے وہ خود اپنے

اہل شوریٰ کے درمیان بیٹھتے اور مباحثوں میں حصہ لیتے تھے آزادانہ فضا میں ہر شریک مجلس اپنے ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیتا تھا۔ تمام معاملات اہل حل وعقد کے سامنے بے کم وکاست رکھ دیے جاتے اور کچھ چھپا کر نہ رکھا جاتا فیصلے دلیل کی بنیاد پر ہوتے تھے نہ کہ کسی کے رعب واثر، یا کسی کے مفاد کی پاسداری، یا کسی جتھ بازی کی بنیاد پر۔ پھر یہ خلفاء اپنی قوم کا سامنا صرف شوریٰ کے واسطہ ہی سے نہ کرتے تھے، بلکہ براہ راست ہر روز پانچ مرتبہ نماز باجماعت میں، ہر ہفتہ جمعہ کے اجتماع میں ہر سال عیدین اور حج کے اجتماعات میں ان کو قوم سے اور قوم کو ان سے سابقہ پیش آتا تھا۔ ان کے گھر عوام کے درمیان تھے اور کسی حاجب ودربان کے بغیر ان کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے تھے وہ بازاروں میں کسی محافظ دستے اور رہٹو بچو کے اہتمام کے بغیر عوام کے درمیان چلتے پھرتے تھے۔ ان تمام مواقع پر ہر شخص کو انہیں روکنے، ان پر تنقید کرنے، اور ان سے محاسبہ کرنے کی کھلی آزادی تھی اور اس آزادی کے استعمال کی وہ محض اجازت ہی نہ دیتے تھے بلکہ اس کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے۔

- حضرت ابو بکرؓ نے اپنی خلافت کی پہلی ہی تقریر میں علی الاعلان کہہ دیا کہ اگر میں سیدھا چلوں تو میری مدد کرو، اگر ٹیڑھا ہو جاؤں تو مجھے سیدھا کرو۔
- حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ لوگوں سے پوچھا، اگر میں بعض معاملات میں ڈھیل اختیار کرلوں تو تم کیا کروگے۔ حضرت بشرؓ بن سعد نے کہا، اگر آپ ایسا کریں گے تو ہم آپ کو تیر کی طرح سیدھا کردیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تب تم کام کے لوگ ہو۔
- سب سے زیادہ سخت تنقیدوں سے حضرت عثمانؓ کو سابقہ پیش آیا، اور انہوں نے کبھی کسی کا منہ زبردستی بند کرنے کی کوشش نہ کی بلکہ ہمیشہ اعتراضات اور تنقیدوں کے جواب میں برسرعام اپنی صفائی پیش کی۔

حضرت علیؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں خوارج کی انتہائی بدزبانیوں کو بڑے ٹھنڈے دل سے برداشت کیا۔ ایک مرتبہ پانچ خارجی ان کے پاس گرفتار کر کے لائے گئے جو علی الاعلان ان کو گالیاں دے رہے تھے اور ان میں سے ایک برسرِ عام کہہ رہا تھا کہ خدا کی قسم میں علیؓ کو قتل کر دوں گا۔ مگر حضرت علیؓ نے ان سب کو چھوڑ دیا اور اپنے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کی بدزبانی کا جواب تم چاہو تو بدزبانی سے دے لو، مگر جب تک وہ عملاً کوئی باغیانہ کارروائی نہیں کرتے، محض زبانی مخالفت کوئی ایسا جرم نہیں ہے جس کی وجہ سے ان پر ہاتھ ڈالا جائے۔

خلافت راشدہ کا یہ دور جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ایک روشنی کا مینار تھا جس کی طرف بعد کے تمام ادوار میں فقہاء و محدثین اور عام دیندار مسلمان ہمیشہ دیکھتے رہے اور اسی کو اسلام کے مذہبی، سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی نظام کے معاملہ میں معیار سمجھتے رہے۔

(خلافت و ملوکیت صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۲)

وہ معاشرہ صحابہ کرامؓ جن کے افراد تھے

صحابہ کرامؓ نظم و اطاعت کی کسوٹی پر

وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُھُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ؀ (التوبہ: ۱۱۸)

ترجمہ: اور ان تینوں کو بھی اس نے معاف کیا جن کے معاملہ کو ملتوی کر دیا گیا تھا جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامنِ رحمت کے سوا نہیں، تو اللہ اپنی مہربانی سے انکی طرف پلٹا تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں، یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے

یہ تینوں صاحب کعب بن مالکؓ، ہلال بن امیہؓ، اور مرارہ بن ربیعؓ تھے جیسا کہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں، تینوں سچے مومن تھے اس سے پہلے اپنے اخلاص کا بارہا ثبوت دے چکے تھے۔ قربانیاں کر چکے تھے۔ آخر الذکر دو اصحاب تو غزوہ بدر کے شرکاء میں سے تھے جنکی صداقت ایمانی ہر شبہ سے بالاتر تھی۔ اور اول الذکر بزرگ اگرچہ بدری نہ تھے لیکن بدر کے سوا ہر غزوہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ان خدمات کے باوجود جو سستی

اس نازک موقع پر جبکہ تمام قابلِ جنگ اہلِ ایمان کو جنگ کے لیے نکل آنے کا حکم دیا گیا تھا ان حضرات نے دکھائی اس پر سخت گرفت کی گئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک سے واپس تشریف لاکر مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ کوئی ان سے سلام کلام نہ کرے۔ چالیس دن کے بعد ان کی بیویوں کو بھی ان سے الگ رہنے کی تاکید کردی گئی۔ فی الواقع مدینہ کی بستی میں ان کا وہی حال ہوگیا تھا جس کی تصویر اس آیت میں کھینچی گئی ہے۔ آخر کار جب ان کے مقاطعہ کو ۵۰ دن ہوگئے تب معافی کا یہ حکم نازل ہوا۔

ان تینوں صاحبوں میں سے حضرت کعب بن مالکؓ نے اپنا قصہ بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو غایت درجہ سبق آموز ہے۔ اپنے بڑھاپے کے زمانے میں جبکہ وہ نابینا ہوچکے تھے، انہوں نے اپنے صاحبزادے عبداللہ سے جو ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں چلایا کرتے تھے، یہ قصہ خود بیان کیا:

"غزوہ تبوک کی تیاری کے زمانہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی مسلمانوں سے شرکتِ جنگ کی اپیل کرتے تھے، میں اپنے دل میں ارادہ کر لیتا تھا کہ چلنے کی تیاری کرونگا پھر واپس آکر سستی کر جاتا تھا اور کہتا تھا کہ ابھی کیا ہے، جب چلنے کا وقت آئے گا تو تیار ہونے کیا دیر لگتی ہے اسی طرح بات ٹلتی رہی یہاں تک کہ لشکر کی روانگی کا وقت آگیا اور میں تیار نہ تھا۔ میں نے دل میں کہا کہ لشکر کو چلنے دو میں ایک دو روز بعد راستہ ہی میں اس سے جا ملوں گا۔ مگر پھر وہی سستی مانع ہوئی حتیٰ کہ وقت نکل گیا۔

اس زمانہ میں جب میں مدینہ میں رہا میرا دل یہ دیکھ دیکھ کر بے حد کڑھتا تھا کہ میں پیچھے جن لوگوں کے ساتھ رہ گیا ہوں وہ یا تو منافق ہیں یا وہ ضعیف اور مجبور لوگ جن کو اللہ نے معذور کر رکھا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبوک سے واپس تشریف لائے تو حسبِ معمول آپؐ نے پہلے مسجد میں آکر دو رکعت نماز پڑھی، پھر لوگوں سے ملاقات کے لیے بیٹھے۔ اس

مجلس میں منافقین نے آ آکر اپنے عذرات لمبی چوڑی قسموں کے ساتھ پیش کرنے شروع کیے۔ یہ ۸۰ سے زیادہ آدمی تھے حضورؐ نے ان میں سے ایک ایک کی بناوٹی باتیں سنیں ان کے ظاہری عذرات کو قبول کرلیا، اور ان کے باطن کو خدا پر چھوڑ کر فرمایا خدا تمہیں معاف کرے۔ پھر میری باری آئی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ آپؐ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا "تشریف لائیے، آپ کو کس چیز نے روکا تھا؟" میں نے عرض کیا خدا کی قسم اگر میں اہلِ دنیا میں سے کسی کے سامنے حاضر ہوا تو ضرور کوئی نہ کوئی بات بنا کر اس کو راضی کرنے کی کوشش کرتا، باتیں بنانی تو مجھے بھی آتی ہیں، مگر آپ کے متعلق میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر اس وقت کوئی جھوٹا عذر پیش کر کے میں نے آپ کو راضی کر بھی لیا تو اللہ ضرور آپ کو مجھ سے پھر ناراض کر دے گا۔ البتہ اگر سچ کہوں تو چاہے آپ ناراض ہی کیوں نہ ہوں، مجھے امید ہے کہ اللہ میرے لیے معافی کی کوئی صورت پیدا فرمادے گا واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس کوئی عذر نہیں ہے جسے پیش کرسکوں، میں جانے پر پوری طرح قادر تھا۔" اس پر حضورؐ نے فرمایا " یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی۔ اچھا، اٹھ جاؤ اور انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تمہارے معاملے میں کوئی فیصلہ کرے۔" میں اٹھا اور اپنے قبیلے کے لوگوں میں جا پہنچا۔ یہاں سب کے سب میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے بہت ملامت کی کہ تو نے کوئی عذر کیوں نہ کر دیا۔ یہ باتیں سن کر میرا نفس بھی کچھ آمادہ ہونے لگا کہ پھر حاضر ہو کر کوئی بات بنا دوں۔ مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ دو اور صالح آدمیوں (مرارہ بن ربیعؓ اور ہلال بن امیہؓ) نے بھی وہی سچی بات کہی ہے جو میں نے کہی تھی، تو مجھے تسکین ہو گئی اور میں سچائی پر جما رہا۔

اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عام حکم دے دیا کہ ہم تینوں آدمیوں سے کوئی بات نہ کرے۔ وہ دونوں تو گھر بیٹھ گئے، مگر میں نکلتا تھا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا تھا، بازاروں میں چلتا پھرتا تھا اور کوئی مجھ سے بات نہ کرتا تھا۔ ایسا معلوم

یہ سرزمین بالکل بدل گئی ہے میں یہاں اجنبی ہوں اور اس بستی میں کوئی بھی میرا واقف کار نہیں۔ مسجد میں نماز کے لیے جاتا تھا، حسب معمول نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا تھا مگر بس انتظار ہی کرتا رہ جاتا تھا کہ جواب کے لیے آپؐ کے ہونٹ جنبش کریں نماز میں نظریں چرا کر حضورؐ کو دیکھتا تھا کہ آپؐ میری طرف دیکھتے رہتے، اور جہاں میں نے سلام پھیرا کہ آپ نے میری طرف سے نظر ہٹائی ایک روز میں گھبرا کر اپنے چچا زاد بھائی اور بچپن کے یار ابو قتادہ کے پاس گیا اور ان کے باغ کی دیوار پر چڑھ کر انہیں سلام کیا مگر اس اللہ کے بندے نے سلام کا جواب تک نہ دیا۔ میں نے کہا ابو قتادہؓ میں تم کو خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا میں خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت نہیں رکھتا؛ وہ خاموش رہے میں نے پھر پوچھا وہ پھر خاموش رہے۔ تیسری مرتبہ جب میں نے قسم دے کر یہی سوال کیا تو انہوں نے بس اتنا کہا کہ "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے" اس پر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور میں دیوار سے اتر آیا۔ انہی دنوں ایک دفعہ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ شام کے نبطیوں میں سے ایک شخص مجھے ملا اور اس نے شاہ غسان کا خط حریر میں لپٹا ہوا مجھے دیا۔ میں نے کھول کر پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ ہم نے سنا ہے تمہارے صاحب نے تم پر ستم توڑ رکھا ہے، تم کوئی ذلیل آدمی نہیں ہو، نہ اس لائق ہو کہ تمہیں ضائع کیا جائے، ہمارے پاس آجاؤ تو ہم تمہاری قدر کریں گے۔" میں نے کہا یہ ایک اور بلا نازل ہوئی اور اسی وقت اس خط کو چولہے میں جھونک دیا۔

چالیس دن اس حالت پر گزر چکے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا آدمی حکم لے آیا کہ اپنی بیوی سے بھی علیحدہ ہو جاؤ میں نے پوچھا کیا طلاق دے دوں؛ جواب ملا نہیں، بس الگ رہو۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم اپنے میکے چلی جاؤ اور انتظار کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔

پچاسویں دن صبح کی نماز کے بعد میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا اور

اپنی جان سے بیزار ہو رہا تھا کہ یکایک کسی شخص نے پکار کر کہا "مبارک ہو کعب بن مالک" میں یہ سنتے ہی سجدے میں گر گیا اور میں نے جان لیا کہ میری معافی کا حکم ہو گیا ہے۔ پھر تو فوج در فوج لوگ بھاگے چلے آ رہے تھے اور ہر ایک دوسرے سے پہلے پہنچ کر مجھ کو مبارکباد دے رہا تھا کہ تیری توبہ قبول ہو گئی۔ میں اٹھا اور سیدھا مسجد نبوی کی طرف چلا دیکھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چمک رہا ہے، میں نے سلام عرض کیا تو فرمایا: "تجھے مبارک ہو یہ دن تیری زندگی میں سب سے بہتر ہے۔" میں نے پوچھا یہ معافی حضورؐ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے؟ فرمایا خدا کی طرف سے، اور یہ آیات سنائیں۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ میری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ میں اپنا سارا مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دوں۔ فرمایا "کچھ رہنے دو کہ یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔" میں نے اس ارشاد کے مطابق اپنا خیبر کا حصہ رکھ لیا۔ باقی سب صدقہ کر دیا۔ پھر میں نے خدا سے عہد کیا کہ راست گفتاری کے صلہ میں اللہ نے مجھے معافی دی ہے اس پر تمام عمر قائم رہوں گا، چنانچہ آج تک میں نے کوئی بات جان بوجھ کر خلاف واقعہ نہیں کہی اور خدا سے امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی مجھے اس سے بچائے گا۔"

یہ قصہ اپنے اندر بہت سے سبق رکھتا ہے جو ہر مومن کے دل نشین ہونے چاہییں:

سب سے پہلی بات تو اس سے یہ معلوم ہوئی کہ کفر و اسلام کی کشمکش کا معاملہ کس قدر اہم اور نازک ہے کہ اس کشمکش میں کفر کا ساتھ دینا تو درکنار، جو شخص اسلام کا ساتھ دینے میں بدنیتی سے بھی نہیں نیک نیتی سے تمام عمر بھی نہیں کسی ایک موقع پر ہی کوتاہی برت جاتا ہے اس کی زندگی بھر کی عبادت گزاریاں اور دینداریاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں، حتیٰ کہ ایسے عالی قدر لوگ بھی گرفت سے بچتے بچتے جو بدر و اُحد اور احزاب و حنین کے سخت معرکوں میں جانبازی کے جوہر دکھا چکے تھے اور جن کا اخلاص و ایمان ذرہ برابر بھی مشتبہ نہ تھا۔

دوسری بات، جو اس سے کچھ کم اہم نہیں، یہ ہے کہ ادائے فرض میں تساہل کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ بسا اوقات محض تساہل ہی تساہل میں آدمی کسی ایسے قصور کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کا شمار بڑے گناہوں میں ہوتا ہے، اور اس وقت یہ بات اسے پکڑ سے نہیں بچا سکتی کہ اس نے اس قصور کا ارتکاب بدنیتی سے نہیں کیا تھا۔

پھر یہ قصہ اس معاشرے کی روح کو بڑی خوبی کے ساتھ ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں بنا تھا ایک طرف منافقین ہیں جن کی غداریاں سب پر آشکارا، مگر ان کے ظاہری عذر سن لیے جاتے ہیں اور درگذر کیا جاتا ہے، کیونکہ اُن سے خلوص کی امید ہی کب تھی کہ اب اس کی عدم کی شکایت کی جاتی۔ دوسری طرف ایک آزمودہ کار مومن ہے جس کی جاں نثاری پر شبہ تک ... کی گنجائش نہیں، اور وہ جھوٹی باتیں بھی نہیں بناتا، صاف صاف قصور کا اعتراف کر لیتا ہے، مگر اس پر غضب کی بارش برسا دی جاتی ہے۔ نہ اس بنا پر کہ اس کے مومن ہونے میں کوئی شبہ ہو گیا ہے، بلکہ اس بنا پر کہ مومن ہو کر اس نے وہ کام کیوں کیا جو منافقوں کے کرنے کا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ زمین کے نمک تو تم ہو، تم سے بھی اگر نمکینی حاصل نہ ہوئی تو پھر اور نمک کہاں سے آئے گا۔ پھر لطف یہ کہ اس سارے قضیہ میں لیڈر جس شان سے سزا دیتا ہے اور پیرو جس شان سے اس سزا کو بھگتتا ہے، اور پوری جماعت جس شان سے اس سزا کو نافذ کرتی ہے اس کا ہر پہلو بے نظیر ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی زیادہ تعریف کی جائے۔ لیڈر نہایت سخت سزا دے رہا ہے مگر غصّے اور نفرت کے ساتھ نہیں، گہری محبّت کے ساتھ دے رہا ہے۔ باپ کی طرح شعلہ بار نگاہوں کا ایک گوشہ ہر وقت یہ خبر دے رہا ہے کہ تجھ سے دشمنی نہیں ہے بلکہ تیرے قصور پر تیری ہی خاطر دل دکھا ہے تو درست ہو جائے تو یہ سینہ تجھے چمٹا لینے کے لیے بے چین ہے۔ پیرو سزا کی سختی پر تڑپ رہا ہے مگر صرف یہی نہیں کہ اس کا قدم جادۂ اطاعت سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں ڈگمگاتا، اور صرف یہی نہیں کہ

اس غرورِ نفس اور حمیتِ جاہلیہ کا کوئی دورہ نہیں پڑتا، اور علانیہ استکبار پر اتر آتا تو درکنار وہ دل میں اپنے محبوب لیڈر کے خلاف کوئی شکایت تک نہیں آنے دیتا۔ اس کے برعکس وہ لیڈر کی محبت میں اور زیادہ سرشار ہو گیا ہے۔ سزا کے پورے پچاس دنوں میں اس کی نظریں سب سے زیادہ بے تابی کے ساتھ جس کی تلاش میں رہیں وہ یہ تھی کہ سردار کی آنکھوں میں وہ گوشۂ التفات اس کے لیے باقی ہے یا نہیں جو اس کی امیدوں کا آخری سہارا ہے۔ گویا وہ ایک قحط زدہ کسان تھا جس کا سارا سرمایۂ امید بس ایک ذرا سا لکۂ ابر تھا جو آسمان کے کنارے پر نظر آتا تھا۔ پھر جماعت کو دیکھیے تو اس کے ڈسپلن اور اس کی صالح اخلاقی اسپرٹ پر انسان عش عش کر جاتا ہے۔ ڈسپلن کا یہ حال کہ ادھر لیڈر کی زبان سے بائیکاٹ کا حکم نکلا ادھر پوری جماعت نے مجرم سے نگاہیں پھیر لیں۔ جلوت تو درکنار خلوت تک میں کوئی قریب سے قریب رشتہ دار اور کوئی گہرے سے گہرا دوست بھی اس سے بات نہیں کرتا۔ بیوی تک اس سے الگ ہو جاتی ہے۔ خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہے کہ میرے خلوص میں تو تم کو شبہ نہیں ہے، مگر وہ لوگ بھی جو مدت العمر سے اس کو مخلص جانتے تھے، صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم سے نہیں خدا اور اس کے رسولؐ سے اپنے خلوص کی سند حاصل کرو۔ دوسری طرف اخلاقی اسپرٹ اتنی بلند اور پاکیزہ کہ ایک شخص کی چڑھی ہوئی کمان اترتے ہی مردار خوروں کا کوئی گروہ اس کا گوشت نوچنے اور اسے پھاڑ کھانے کے لیے نہیں لپکتا، بلکہ اس پورے زمانہ عتاب میں جماعت کا ایک ایک فرد اپنے اس معتوب بھائی کی مصیبت پر رنجیدہ اور اس کو پھر سے اٹھا کر گلے لگا لینے کے لیے بے تاب رہتا ہے اور معافی کا اعلان ہوتے ہی لوگ دوڑ پڑتے ہیں کہ جلدی سے جلدی پہنچ کر اس سے ملیں اور اسے خوشخبری پہنچائیں۔ یہ نمونہ ہے اس صالح جماعت کا جسے قرآن دنیا میں قائم کرنا چاہتا ہے۔

اس پس منظر میں جب ہم آیتِ زیرِ بحث کو دیکھتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح

ہو جاتی ہے کہ ان صاحبوں کو اللہ کے دربار سے جو معافی ملی ہے اور اس معافی کے انداز بیان میں جو رحمت و شفقت ٹپکی پڑ رہی ہے اس کی وجہ ان کا وہ اخلاص ہے جس کا ثبوت انہوں نے پچاس دن کی سخت سزا کے دوران دیا تھا۔ اگر قصور کر کے وہ اکڑتے اور اپنے لیڈر کی ناراضگی کا جواب غصے اور عناد سے دیتے اور سزا ملنے پر اس طرح بپھرتے جس طرح کسی خود پرست انسان کا غرور نفس زخم کھا کر بپھرا کرتا ہے۔ اور مقاطعہ کے دوران میں ان کا طرز عمل یہ ہوتا کہ ہمیں جماعت سے کٹ جانا گوارا ہے مگر اپنی خودی کے بت پر چوٹ کھانا گوارا نہیں ہے، اور اگر یہ سزا کا پورا زمانہ وہ اس دوڑ دھوپ میں گزارتے کہ جماعت کے اندر بددلی پھیلائیں اور بددل لوگوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈ کر اپنے ساتھ ملائیں تاکہ ایک جتھا تیار ہو۔ تو معافی کیسی، انہیں تو بالیقین جماعت سے کاٹ پھینکا جاتا اور اس سزا کے بعد ان کی منہ مانگی سزا ان کو یہ دی جاتی کہ جاؤ اب اپنی خودی کے بت ہی کو پوجتے رہو، اعلاء کلمۃ الحق کی جدوجہد میں حصہ لینے کی سعادت اب تمہارے نصیب میں کبھی نہ آئے گی۔ لیکن ان تینوں صاحبوں نے اس کڑی آزمائش کے موقع پر یہ راستہ اختیار نہیں کیا، اگرچہ یہ بھی ان کے لیے کھلا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انہوں نے وہ روش اختیار کی جو ابھی آپ دیکھ آئے ہیں۔ اس روش کو اختیار کر کے انہوں نے ثابت کر دیا کہ خدا پرستی نے ان کے سینے میں کوئی بت باقی نہیں چھوڑا ہے جسے وہ پوجیں، اور اپنی پوری شخصیت کو انہوں نے راہِ خدا کی جدوجہد میں جھونک دیا ہے اور وہ اپنی واپسی کی کشتیاں اس طرح جلا کر اسلامی جماعت میں آئے ہیں کہ اب یہاں سے پلٹ کر کہیں اور نہیں جا سکتے۔ یہاں کی ٹھوکریں کھائیں مگر یہیں مریں گے اور کھپیں گے۔ کسی دوسری جگہ بڑی سے بڑی عزت ملتی ہو تو یہاں کی ذلت چھوڑ کر اسے

فرماتا ہے کہ "ہم ان کی طرف پلٹے تاکہ وہ ہماری طرف پلٹ آئیں" ان چند لفظوں میں اس حالت کی تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ آقا نے پہلے تو ان بندوں سے نظر پھیر لی تھی مگر جب وہ بھاگے نہیں بلکہ دل شکستہ ہو کر اسی کے در پر بیٹھ گئے تو ان کی شانِ وفاداری دیکھ کر آقا سے خود نہ رہا گیا، جوشِ محبت سے بے قرار ہو کر وہ آپ نکل آیا تاکہ انہیں دروازے سے اٹھا لائے۔

(تفہیم القرآن جلد دوم ۲۴۵ تا ۲۴۹)

صحابہ کرامؓ۔ رزم و بزم میں

سوال:۔ مجھے چند روز قبل فضائل صحابہؓ کے موضوع پر اظہارِ خیال کا موقع ملا۔ میں نے حسبِ توفیق مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی تشریح کی۔ بعد میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ قرآن شریف تو صحابہؓ کی یہ صفت بیان کر رہا ہے لیکن واقعات کی تصویر اس کے برعکس ہے۔ جنگ جمل وصفین میں دونوں طرف اکابر صحابہؓ موجود تھے۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ بھی ایک فریق کے ہمراہ تھیں۔ ان واقعات کی روشنی میں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کی صحیح توجیہ کیا ہو سکتی ہے؟

جواب:۔ آیت اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ پر جس شبہ کا اظہار محترم سائل نے کیا ہے وہ دو مفروضوں پر مبنی ہے، اور دونوں ہی خلافِ حقیقت ہیں۔ ان کا پہلا مفروضہ یہ ہے کہ کسی شخص یا گروہ کی تعریف میں جب کوئی بات کہی جائے تو لازماً اسے اس معنی میں لینا چاہیے کہ اس شخص یا اس گروہ میں کبھی کوئی جزئی امر بھی اس کے خلاف نہ پایا جائے۔ حالانکہ انسانوں کی تعریف جب بھی کی جاتی ہے ان کے غالب حال کے لحاظ سے کی جاتی ہے، اور کبھی کبھار کوئی چیز اس کے خلاف نظر آئے تو وہ کلی حکم میں قادح نہیں سمجھی جاتی۔ ہم صحابہ کرام کو دنیا کا سب سے زیادہ اتقیٰ و اصلح گروہ قرار دیتے

ہیں۔ یہ حکم ان کی مجموعی سیرت کے لحاظ سے ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس گروہ میں کبھی بشریت کے تقاضوں سے جزئی کمزوریوں کا سرے سے ظہور ہی نہیں ہوتا تھا۔ آخر اس زمانہ میں بھی کسی کو زنا اور کسی کو چوری کی سزا اور کسی کو قذف کی سزا تو دی ہی گئی تھی، اور صحابیت کا شرف ان سزا یافتہ لوگوں کو بھی حاصل تھا۔ کیونکہ ایمان کے بعد جس شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر ہوئی وہ بہرحال صحابی ہے، اور ان قصوروں کی بنا پر بہرحال نہ صفتِ ایمان اُن سے سلب ہوئی تھی نہ صفتِ صحابیت۔ مگر کیا یہ بات کہ کبھی اس معاشرے میں زنا اور چوری اور قذف کے گناہوں کا صدور بھی ہو گیا تھا اس مجموعی حکم میں قادح ہو سکتی ہے کہ وہ معاشرہ صلاح و تقویٰ میں اس بلند ترین مرتبے پر پہنچا ہوا تھا جس پر کبھی کوئی انسانی معاشرہ نہیں پہنچا؟ اسی طرح رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی صفت صحابہ کرامؓ کی مجموعی سیرت اور ان کے غالب حال کے لحاظ سے ہے، اور واقعہ یہ ہے کہ کسی انسانی معاشرے میں آپس کی محبت و الفت، باہمی ہمدردی و خیر اندیشی اور ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ اور مرتبے کا احترام اس درجہ کا نہیں پایا جاتا اور نہ پایا گیا ہے، جیسا صحابہ کرامؓ کے معاشرے میں نظر آتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کے اندر یہ صفت انتہائی ممکن کمال تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہے جس کا کسی انسانی معاشرے کے حق میں تصور کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان جب تک انسان ہیں، ان کے اندر بہرحال کبھی نہ کبھی اختلاف بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ اختلافات لڑائی جھگڑے کی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ بھی انسان ہی تھے عالم بالا سے کوئی فوق البشر مخلوق حضورؐ کی صحبت و معیت کے لیے اتر کر نہیں آئی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہن سہن، لین دین اور اجتماعی زندگی کے معاملات کرتے ہوئے لامحالہ بتقاضائے بشریت بھی ان میں اختلافات ہو جاتے تھے، اور بعض اوقات یہ اختلافات شدید نوعیت بھی اختیار کر گئے ہیں۔ لیکن جزئی واقعات سے اس کلی حکم

میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ ان کی امتیازی صفت رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تھی کیونکہ ان کا غالب حال یہی تھا۔

دوسرا مفروضہ جو ان کے اس شبہ کے پیچھے کام کر رہا ہے، یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں کبھی جو اختلاف رونما ہوئے ہیں وہ اس نوعیت کے تھے کہ ان سے رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی صفت بالکل ہی سلب ہو گئی تھی۔ حالانکہ ان اختلافات کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ اس بات پر گواہ ہے کہ یہ مقدس انسان جب آپس میں لڑ بھی جاتے تھے تو ان کی لڑائی میں بھی رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ہونے کی ایک انوکھی شان پائی جاتی تھی۔ بے شک وہ جمل اور صفین میں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئے ہیں مگر کیا دنیا کی کسی خانہ جنگی میں آپ فریقین کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے ہوئے بھی ایک دوسرے کا وہ احترام ملحوظ رکھتے دیکھتے ہیں جو ان بزرگوں کی لڑائی میں نظر آتا ہے۔ وہ نیک نیتی کے ساتھ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہوئے لڑے تھے۔ نفسانی عداوتوں اور اغراض کی خاطر نہیں لڑے تھے۔ انہیں افسوس تھا کہ دوسرا فریق ان کی پوزیشن غلط سمجھ رہا ہے اور خود غلط پوزیشن اختیار کرتے ہوئے بھی اپنی غلطی محسوس نہیں کر رہا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو فنا کر دینے پر تلے ہوئے نہیں تھے، بلکہ اپنی دانست میں دوسرے فریق کو راستی پر لانا چاہتے تھے ان میں سے کسی نے کسی کے ایمان سے انکار نہیں کیا، اس کے اسلامی حقوق سے انکار نہیں کیا بلکہ اس کی فضیلت اور اس کی اسلامی خدمات کا انکار بھی نہیں کیا انہوں نے ایک دوسرے کو ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش نہیں کی لڑنے میں انہوں نے لڑائی کا حق ضرور ادا کیا، مگر لڑ کر گر جانے والے کے لیے وہ سراپا رحمت و شفقت تھے، اور گرفتار ہو جانے والے پر مقدمہ چلانا اور اس کو سزا دینا یا اس کو ذلیل و خوار کرنا تو درکنار، قید رکھنا اور کسی درجے میں بھی نشانۂ عتاب بنانا تک

انہوں نے گوارا نہ کیا۔ ذرا دیکھیے عین موقع پر جب کہ جنگ جمل میں دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئی ہیں، حضرت علیؓ حضرت زبیرؓ کو پکارتے ہیں اور وہ ان سے ملنے کے لیے نکل آتے ہیں۔ دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرے سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اس پر اچانک حملہ کر دے گا صفوں کے درمیان دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر روتے ہیں۔ دونوں طرف کی فوجیں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہیں کہ یہ ایک دوسرے سے لڑنے آئے تھے اور اب گلے مل کر رو رہے ہیں۔ دونوں تنہائی میں بات کر کے اپنی اپنی فوجوں کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔ حضرت علی کی فوج والے ان سے پوچھتے ہیں کہ امیر المومنین! آپ عین لڑائی کے موقع پر ننگے سر ایک شخص سے تنہا ملنے چلے گئے؟ جواب میں فرماتے ہیں، جانتے ہو وہ شخص کون تھا؟ وہ صفیہ عمۂ رسول اللہؐ کا بیٹا تھا۔ میں نے اس کو رسول اللہؐ کی ایک بات یاد دلائی۔ اس نے کہا، کاش یہ بات مجھے پہلے یاد آجاتی تو میں آپ کے مقابلے میں لڑنے نہ آتا۔ لوگ اس پر کہتے ہیں کہ الحمد للہ، اے امیر المومنین یہ رسول اللہؐ کے شاہسوار اور حواری ہیں، ہم کو انہی کا سب سے زیادہ خوف تھا، دوسری طرف حضرت زبیرؓ پلٹ کر اپنی فوج میں جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شرک اور اسلام میں جب بھی کسی لڑائی میں شریک ہوا ہوں، مجھے اس میں بصیرت حاصل تھی، مگر اس لڑائی میں نہ میری رائے میرا ساتھ دیتی ہے نہ بصیرت۔

یہ شان تھی ان لوگوں کی آپس کی لڑائی کی۔ وہ تلوار بھی ایک دوسرے پر اٹھا کر رحماء بینہم ہی رہتے تھے۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر، عزت، محبت، اسلامی حقوق کی مراعات، اس شدید خانہ جنگی کی حالت میں بھی جوں کی توں برقرار رہی۔ اس میں یک سر ذرہ فرق نہ آیا۔ بعد کے لوگ کسی کے حامی بن کر ان میں سے کسی کو گالیاں دیں، تو یہ ان کی اپنی بدتمیزی ہے، مگر وہ لوگ آپس کی عداوت میں نہیں لڑے تھے اور لڑ کر بھی ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوئے تھے۔

(رسائل و مسائل جلد سوم۔ ص۔ ۱۷۰ تا ۱۷۷)